(غلام گردش)

تعریف صرف مرنے کے بعد کیوں ہوتی ہے؟

''پچھلے مئی سے میں نے صرف تین مرتبہ گرم کھانا کھایا ہے''۔ یہ الفاظ دنیا کے عظیم ترین مصور وان گوگ (Van Gogh) کے ہیں جو خط میں اپنے بھائی تھیو کو فروری 1886 میں لکھے تھے۔ زندگی کے بیشتر حصے میں وان گوگ، تمباکو، کافی اور ٹھنڈی روٹی پر زندہ رہا۔ اسکی کئی وجوہات تھیں۔ بڑی وجہ تو یہ کہ اسکے مالی وسائل اس قدر کم تھے کہ تین وقت کا کھانا خرید ہی نہیں سکتا تھا۔ دوسرا، شائد یہ بھی کہ وہ کھانے کو حد درجہ غیر ضروری سمجھتا تھا۔ جو پیسے ڈبل روٹی خریدنے پر صَرف کرنے ہوتے تھے۔ وہ انہی قلیل پیسوں سے رنگ اور برش خرید لیتا تھا۔ عام لوگ بلکہ خاص لوگ بھی، اس سے حد درجہ دور رہتے تھے۔ وان گاگ کو بیوقوف، پاگل اور ناکام آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کی عدم توجہ سے وہ نایاب مصور آہستہ آہستہ خوفناک ڈپریشن میں چلا گیا۔ بائیں کان میں ہر وقت عجیب وغریب آوازیں آتی رہتی تھیں۔ خوفناک آوازیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں۔ اسکا حل صرف یہ تھا، کہ وہ دیوانہ وار پینٹنگز بناتا رہتا تھا۔ کئی بار دن میں گھر سے تھوڑا سا دور، ایک کھلیان میں جا کر تصویریں بناتا رہتا تھا۔ کسی کو بھی وان گوگ کی پینٹنگز سے واسطہ نہیں تھا۔ دراصل وہ عجیب وغریب حرکتیں کرتا تھا۔ اپنے دوست گاگن (Gauguin) سے لڑائی کے بعد اپنا بائیاں کان خود ہی کاٹ لیا اور پھر ہسپتال چلا گیا۔ اسکے علاوہ کئی بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔ مگر ایک چیز پر وان گاگ کا جذبہ کبھی کم نہیں ہوا، وہ اسکی مصوری کی جدید ٹیکنیک تھی۔ لوگوں سے مکمل طور پر الگ تھلگ رہتا تھا۔ آپ، اسکی جدت کا اندازہ لگائیے۔ پیرس منتقل ہونے سے پہلے، اس نے اینٹ ورپ میں فائن آرٹس اکیڈمی میں داخلہ لے لیا۔ انسٹرکٹر Siberdt سب برٹ نے اسے ایک خاکہ بنانے کیلئے کہا۔ وان گوگ نے اپنی ذہنی فکر کے حساب سے عورت کی تصویر بنائی۔ سبرٹ نے، برش لیکر اس تصویر کی تصیح کرنی چاہی تو استاد اور شاگرد دونوں میں لڑائی ہوگئی۔ وان گاگ نے تصویر کو ٹھیک کرنے کی تجویز مسترد کردی۔ اسکے خیال میں انسانوں کو انکے جذبات کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ یہ تصویر کلاس میں پھاڑ دی گئی۔ وان گوگ حد درجہ بے عزتی کروانے کے بعد پیرس منتقل ہوگیا۔ بیس برس یعنی عین جوانی میں وان گاگ نے اپنے پستول سے خودکشی کرلی۔ جنازے میں صرف بیس لوگ تھے۔ پوری زندگی میں اس عظیم مصور نے اکیس سو تصاویر بنائیں۔ ان میں آٹھ سو ساٹھ آئل پینٹنگز تھیں۔ پوری زندگی عسرت، حد درجہ ذلت اور عدم توجہ سے ہارا ہوا انسان، کسی بھی توجہ کا مستحق قرار نہیں دیا گیا۔ 1890 میں سفرِ عدم روانہ ہونے والا انسان کسی توجہ کے بغیر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مرنے کے تھوڑے عرصے کے بعد اسکا کام، اسکے دوست اور خاندان والے لوگوں کے سامنے لیکر آئے تو ایک حشر برپا ہوگیا۔ اسکی پھول پتوں، کھلیانوں اور لوگوں کی بنائی ہوئی پورٹریٹ دنیا کی عظیم مصوری قرار دی گئی۔ کیا آپ یقین فرمائینگے کہ آج سے تیس سال قبل، اس دیوانے آدمی کی صرف ایک تصویر 100 ملین ڈالر کی فروخت ہوئی۔ آج بھی قیمت کے لحاظ سے وان گاگ کی بنائی ہوئی تصاویر دنیا میں سب سے بیش قیمت تصور کی جاتی ہیں۔ اس کالم کا مقصد ہرگز ہرگز وان گاگ کی عظیم مصوری پر بات کرنا نہیں ہے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ وان گاگ، موت کے بعد مقبول ہوا۔ اسے قابلِ توجہ سمجھا گیا اور وہ عزت کا حقدار ٹھہرا۔ اسکی قدر مرنے کے بعد ہوئی۔

یہ سب کچھ میں اپنی سوسائٹی کے پسِ منظر میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ہر تھوڑے سے وقفہ کے بعد، ہمارا کوئی نہ کوئی اداکار، مصور، گائک، شاعر اور اسطرح کے تخلیق کار سفرِ عدم پر چلے جاتے ہیں۔ وفات کے بعد حد درجہ افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ انکی یاد میں لوگ تعزیاتی کانفرنس منعقد کرتے ہیں۔ تقاریر ہوتی ہیں۔ انکو عظمت کے مینار پر بٹھایا جاتا ہے۔ تعریف کے ڈونگرے بجائے جاتے ہیں۔ فن پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ ہاں ایک اور بات۔ وزیر اعظم، وزراء اعلیٰ اور اس قبیل کے لوگ بیجان قسم کے پہلے سے لکھے ہوئے بیانات جاری کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ملک کا بہت قیمتی سرمایہ لُٹ گیا ہے۔ مگر میرا نکتہ حد درجہ مختلف ہے۔ مرنے والے تخلیق کاروں کی زندگی میں انکی قدر ہرگز نہیں کی جاتی جسکے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ انہیں وہ مالی آسودگی نہیں دی جاتی، جس سے باعزت زندگی گزار لیں۔ اس سوال کا جواب ہر انسان کی نظر میں مختلف ہوسکتا ہے۔ ویسے میں اسکا جواب، معاشرے کی بھرپور منافقت، دوعملی اور عملی بے حسی میں تلاش کرتا ہوں۔ ہم مکمل طور پر جھوٹے لوگ ہیں۔ جس تخلیق کار کو زندگی میں لوگ دس منٹ سے زیادہ برداشت نہیں کرتے۔ مرنے کے بعد اسکی یاد میں ٹسوے بہاتے ہیں۔ تمام تخلیق کاروں کی گزارش نہیں کر رہا۔ مگر بیشتر لوگ اپنی زندگی میں بے جا تنقید کے نشتر برداشت کرتے رہتے ہیں۔ Performers کی بات چھوڑ دیجئے۔ ہم سیاستدانوں اور مذہبی علماء تک تو نہیں بخشتے۔ میری ہوش کی زندگی میں ذوالفقار علی بھٹو پر بے رحمانہ غصہ اور تنقید ہوتی تھی۔ میرٹ یا ڈی میرٹ کی بات نہیں کر رہا۔ بھٹو کی سیاسی زندگی پر بھی عرض نہیں کر رہا۔ مگر بھٹو کے عدالتی قتل تک بہت کم لوگ ہیں، جنہوں نے اس پورے پراسس پر تنقید کی ہو۔ نفرت کا اندازہ لگائیے۔ کہ پنجاب کے چیف جسٹس سے ایک گزشتہ نامور سیاستدان نے وہ قلم تحفہ میں مانگ لیا، جس سے بھٹو کے سزائے موت کے فیصلے پر دستخط کیے تھے۔ مگر صرف تیس یا چالیس سال بعد، ہر باشعور آدمی یہ کہتا نظر آئیگا کہ بھٹو کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ اسے ایک منصوبہ بندی کے تحت عدالت کے ذریعے قتل کیا گیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس وقت کے ایک سپریم کورٹ کے جج نے برملا اعتراف کیا کہ ان پر بھٹو کی سزائے موت کی توثیق کرنے کیلئے حد درجہ دباؤ تھا۔ بھٹو سیاسی طور پر عظیم تھا یا نہیں۔ اس پر دو رائے ہوسکتی ہیں۔ مگر عدالت کے اوپر تنقید آج تک جاری ہے۔ پیپلز پارٹی اسے ایک عظیم سیاسی شہید گردانتی ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب کچھ اسکی موت کے بعد ہوا۔ بھٹو کے بدترین مخالف بھی تیس برس سے اسکی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔

بالکل یہی معاملہ اس سوسائٹی کے ہر تخلیق کار کے ساتھ درپیش ہے۔ مرحوم منیر نیازی ایک دن ترنگ میں کہنے لگے، کہ ''لوگ مجھے قومی سرمایہ بتاتے ہیں۔ مگر میں وہ سرمایہ ہوں جسے قوم نے خورد برد کرلیا ہے''۔ وہ ادیب اور شاعر جو منیر نیازی کو زندگی میں انہیں ایک بلانوش اور معمولی درجہ کا شاعر گردانتے تھے۔ آج اس شاعر کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ یہ بے معنی الفاظ صرف مرنے کے بعد ادا کیے جاتے ہیں۔ حبیب جالب کے ساتھ بھی بعینہ یہی معاملہ ہوا۔ وہ جس نظام کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے مفلسی کی پاتال میں زندگی گزارتا رہا۔ اسی نظام کے سرکردہ لوگ، آج جلسوں میں اسکی شاعری گا گا کر پڑھتے ہیں اور لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ وہ بھی برملا کہتے ہیں کہ جالب ایک عظیم شاعر تھا۔ سوال بدستور موجود ہے کہ جالب کی زندگی میں اسے کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اسکی صحت، خوشحالی اور ذاتی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے کیوں توجہ نہیں دی گئی جسکا وہ سانس لیتے ہوئے حقدار تھا۔ سعادت حسن منٹو جیسا عظیم لکھاری دس دس روپے کی محتاجی

دیکھتا رہا۔لوگ پاک ٹی ہاؤس سے اُٹھا کر اپنے نام کی کہانیاں لکھواتے رہتے تھے۔قلندر صفت آدمی،اپنے ذاتی اور خاندانی اخراجات پورے کرنے کیلئے ایڑیاں رگڑتا تھا۔پھر کہیں جا کر زندگی کا دورانیہ چلتا تھا۔مگر آج،سعادت حسن منٹو پر فلمیں بن رہی ہیں۔اسے پاک وہند کا عظیم ترین لکھاری گردانا جا رہا ہے۔اسکی سوچ کو ملک کا لبرل طبقہ،اپنے فکر کا منبع قرار دیتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ منٹو کا ایک ایک افسانہ،خزانے میں تولنے کے قابل ہے۔مگر زندگی میں منٹو ہماری سوسائٹی کے ظلم وستم کا بھرپور شکار رہا۔مرنے کے بعد،آج تک،اسکی ہر سطح پر تعریف ہوتی رہتی ہے۔سلیم اقبال جیسے عظیم موسیقار کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں،میرے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔وہ اُستاد،جسکی صرف دھن،آج بھی لوگوں کو رُلا دیتی ہے۔یعنی''اے راہِ حق کے شہیدوں' وفا کی تصویرو،تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں''۔معاشرے کی مکمل بے اعتنائی کا شکار رہا۔انکا دوپہر کا کھانا کیا تھا۔اکثر اوقات دو تین روپے کے پکوڑے اور ایک نان۔گوالمنڈی سے یہ کھانا اکثر کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔کچے پکے مکان میں رہتے تھے۔اس جیسا عظیم موسیقار،غربت میں انتہائی تکلیف میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ویسے سلیم اقبال کو تو اس قابل بھی نہیں سمجھا گیا کہ عوامی سطح پر اسکے فن کا اعتراف کیا جائے،مگر موسیقی سے منسلک لوگ سلیم اقبال کی قدر کو جانتے ہیں۔تھیٹر سے منسلک اکثر لوگ پوری زندگی دنیا کو ہنساتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔لوگ صرف انکی موجودگی سے خوش ہو جاتے ہیں۔مگر ان میں سے اکثر کو معاشرہ وہ اہمیت اور عزت نہیں دیتا جو انکا حق ہے۔ہاں،مرنے کے بعد معاملات بالکل متضاد ہو جاتے ہیں۔جب تک وہ زندہ رہتے ہیں۔انہیں میراثی یا کنجر کہا جاتا ہے۔مگر جیسے ہی آنکھ بند ہوتی ہے۔وہ عظیم فنکار یا فنکارہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔درجنوں نہیں،ہزاروں مثالیں ہیں۔انتہائی غمگین اور تکلیف دہ مثالیں۔مگر کوئی پرواہ نہیں کرتا!

فکری اعتبار سے چیلنج کرنا چاہتا ہوں۔تخلیق کاروں کی اکثریت پوری زندگی شدید مسائل کا شکار رہتی ہے۔مگر مرنے کے بعد،یہ مردہ معاشرہ،انکی تعریف کرتے کرتے تھکتا نہیں ہے۔مغرب میں وان گاگ کو مرنے کے بعد جو عملی عزت ملی،ہم تو آج تخلیق کاروں کو دنیا سے جانے کے بعد بھی اتنی توقیر دینے کو تیار نہیں۔ہاں،لفظی تعریف ضرور کرینگے۔ہم ایک عجیب بلکہ بیمار سا معاشرہ ہیں۔جس میں ہم سجدوں میں بھی لوگوں کا بھلا کرنا نہیں سوچتے۔شائد ہم انتظار کرتے ہیں کہ تخلیق کار،ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔پھر کوئی بات کی جائے۔ویسے اس بیجان معاشرے میں تخلیق کار کا پیدا ہونا ایسا جرم ہے،جسکی سزا اسے زندگی میں ہر لمحے ملتی رہتی ہے۔شائد ہم بڑے لوگوں کی موت کے منتظر رہتے ہیں۔مگر اس منفی عمل میں احساس نہیں ہے،کہ ہمارا پورا معاشرہ ہی دم توڑ چکا ہے!

راؤ منظر حیات